کنزہ نوشیر
لیکچرار، یونیورسٹی آف اوکاڑہ

Kinza Nosheer
Lecturer, University of Okara

ناول "میرا گاؤں" میں دیہی تہذیب کا بدلتا منظر نامہ

The changing landscape of rural Civlization in the Novel "Mera Gaon"

Abstract: Ghulam -ul-Saqlain has a valuable place among these novelists. He made the rural society as a main point of his novel. By giving the balance to the village characters he has best explained the differences of their life, feelings and emotions. He was the best painter of rural scerves and environment. He has exposed many sides of life by showing rural lifestyle in his novel.He has depicted the innate Social aspect in a very Charming and Curious way. His pragmatism and observational worth is very effective. He gave a complete shape to the twist of human nature in the perspective of his intense.He was very/ well intimate with his life and we'll informed of the mindset of the rural class.In this articale ,the researcher will highlight the changing landscape of rural civilization in Ghulam -ul-Saqlain Naqvi Novel "Mera Gaon

Key word: Significance, Civilization, cultural values, Festival, History, Beauty of Nature

برصغیر پاک وہند میں شہروں اور دیہاتوں کی تقسیم بہت قدیم ہے۔ شہر تمدنی ترقی کا مظہر ہے۔ شہر کی نسبت دیہات میں زندگی کی رفتار سست ہے اور اس تمدن میں ترقی کے آثار بھی تیزی سے رونما نہیں ہوتے۔ ماضی میں شہر کا باشندہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیہات کا رخ کرتا تھا لیکن اب شہری خود کفیل اور دیہاتی مجبور ہو گئے۔ وہ اپنی خام اشیا کو مشین میں جھونکنے کے لیے شہر کا رخ کرنے لگے ہیں۔ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی نے شہری زندگی میں بڑی وسعت پیدا کی ہے۔ دیہات بیسویں صدی تک مختلف تھا چونکہ اس صدی کا آغاز متعدد معاشی اور ذہنی تبدیلیوں، سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی تحریکوں سے ہوا تھا۔ اس لیے اجدید تعلیم اور صنعتوں کے قیام کے باعث اور شہروں کے بننے کی وجہ سے مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے وابستہ لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ مختلف الخیال لوگوں کے اکھٹے ہونے اور تہذیبی قدروں میں فرق کے باعث لوگوں کو نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بھی دیہی صنعتوں کے زوال کا ایک اہم محرک رہا یوں گاؤں کی اکائی کمزور ہوتی چلی گئی۔ جدید ٹیکنالوجی نے جہاں زندگی کے ہر شعبے پر اثرات مرتب کیے وہاں دیہاتی زندگی پر بھی اس کے اثرات گہرے نظر آتے ہیں۔ دیہی تہذیب کے بدلتے منظر کے حوالے سے ڈاکٹر نورین رزاق لکھتی ہیں:

> ”دیہاتی نظام میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پرانی قدروں کے بدلنے سے کاروبارِ زندگی متاثر ہوا ہے۔ کشیدہ تعلقات، طویل دشمنیاں، معیشت کی بدحالی، شہروں میں قائم شدہ صنعتیں، اچھی اُجرت اور روزگار کے بہتر مواقع سے زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے والے ہاتھوں کی کمی ہو رہی ہے۔ لوگ صدیوں پرانے ناتے توڑ کر اجنبی سرزمینوں کا رخ کر رہے ہیں۔“(۱)

دیہاتی زندگی کا سب سے بڑاالمیہ یہ ہے کہ لوگ فطرت سے دور ہو گئے ہیں۔ پہلے لوگ پیدل سفر کرتے تھے۔ زندگی سادہ تھی جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا دیہاتی زندگی بدلتی گئی۔ دیہات کے نمایاں اور مخصوص ثقافتی عناصر پنہاں ہوتے گئے۔ جدید دور کے تقاضوں نے دیہات کو تیزی سے شہروں میں بدلنا شروع کر دیا ہے اور یوں دیہات فطرت سے کٹتے گئے اور بتدریج آرائشی تصنع کا شکار ہوتے گئے۔ شہری اور دیہاتی تہذیب و تمدن میں جو آویزش رونما ہوئی تھی وہ نہ صرف موجود ہے بلکہ اس نے اپنی نمود کہانیوں اور ناولوں میں متعدد زاویوں سے کی ہے۔ اُردو ناول میں دیہاتی کلچر کی عکاسی خوب سے خوب تر انداز میں کی گئی ہے۔ دیہات کی تہذیب و ثقافت شہر کے کلچر سے خاصی منفرد ہے۔ اُردو ناول نگاروں نے جہاں پر دیہات کے منظر دکھائے ہیں وہاں انھوں نے اُن دیہی خطّوں سے تعلق رکھنے والوں کی دلی کیفیات، محسوسات، تلخ حقائق اور محرومیوں کا ذکر بھی بھرپور انداز میں کیا ہے۔

دیہات کی پیش کش میں ایک نمایاں نام غلام الثقلین نقوی کا ہے جنھوں نے دیہی تہذیب کو اپنی تحریروں کا محور و مرکز بنایا۔ ا ن کا پہلا افسانہ مرے کالج میگزین میں "سانڈنی سوار" 1938ء میں شائع ہوا اور ان کی آخری تحریر "اگلے وقتوں کے لوگ" مئی 2002ء کے اوراق میں شائع ہوئی۔ افسانوں کے علاوہ ناول ''بکھری راہیں''، ''میرا گاؤں''، ''ناولٹ شیر زمان'' اور'' چاند پور کی نیتا مزاحیہ'' مضامین ''ایک طرفہ تماشا ہے''، سفر نامہ، ''ارض تمنا'' شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ قیدی مضامین بھی لکھے جو مختلف علمی و ادبی رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔(۲)

غلام الثقلین نقوی کا تعلق گاؤں سے رہا اس لیے وہ دیہی نظام کے رنگ و فکر کو خوب جانتے تھے۔ ان کے ہاں زندگی میں حرارت اور نغمہ دیہات سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ دیہات کی رنگینیاں ان کے ساتھ جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید غلام الثقلین نقوی کی دیہاتی نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''دیہات سے غلام الثقلین کی محبت اس کی فطری ضرورت ہے۔ اس نے دیہات کی مٹی اور نمک کو اپنے جسم میں رچا بسا لیا ہے۔ اب یہ اس کے خون میں بھی شامل ہو گیا ہے۔''(۳)

ناول "میرا گاؤں" کا مرکزی کردار عبدالرحمان ماہنے کا ہے۔ پورا ناول پنجاب کے گاؤں چک مراد کے گرد گھومتا ہے۔ مصنف نے اس گاؤں کی تصویر کو پیش کرتے ہوئے حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ غلام الثقلین نقوی اپنے خطّے کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی رنگارنگی سے آگاہی رکھتے تھے اور اُسی تہذیب کے سائے میں پلے بڑھے۔ انھوں نے اس ناول کے ذریعے اپنے علاقے کی مٹتی ہوئی تاریخ اور تہذیب کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا اسے اپنے اندر رچا کر صفحہ قرطاس پر اتارا۔ بقول غلام الثقلین نقوی:

> "ہمارا گاؤں ایک سماجی اکائی ہے۔۔۔ شہر میں ہر فرد ایک جزیرہ معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں میں ہر فرد دوسرے سے زنجیر کی کڑی کی طرح وابستہ ہے۔ یہ رشتہ محبت کا بھی ہے اور دشمنی کا بھی ممکن ہے کہ آئندہ پندرہ سالوں میں وابستگی اور ہم آہنگی کی یہ کیفیت گاؤں کی سماجی زندگی سے غائب ہو جائے لیکن آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں اس سماجی وابستگی کا یہ منظر ہر گاؤں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے"(۴)

غلام الثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" "دیہات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے. اس میں دیہاتی لوگوں کے رہن سہن، عادت و اطوار، طرزِ زندگی، ماحول اور مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول میں لائل پور (فیصل آباد) کے ایک چھوٹے سے گاؤں چک مراد کے کسانوں کی حالتِ زار، اُن کا طرزِ زندگی، گاؤں کے باسیوں کے چھوٹے چھوٹے غم، خوشیاں، وفاداریاں اور زمینداروں کے رویوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اکثر دیہاتیوں کی زندگی بڑی دشوار ہوتی ہے۔ جدید دور میں لوگ کو بنیادی ضروریات میسر نہ ہونے کی صورت میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیہاتی قلیل مادی ذرائع کے باوجود صبر و شکر کر کے زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی معاشی و ثقافتی اعتبار سے شہروں سے مختلف ہے۔ وہ سادہ زندگی گزارتے ہیں اور یہی سادگی ان کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنی اس جبلّی کمزوری کے باوجود قومی پیداوار کی افزائش اور فراہمی میں اپنا کلیدی کردار ادا کرنے میں مصروف و محو رہتے ہیں۔ کسانوں کو اپنی ضروریات اور سہولت کے لیے کاریگروں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں فصل کی کٹائی پر لوگوں کو

معاوضہ دیا جاتا ہے۔ایسے لوگوں کو سیپی بھی کہتے ہیں۔کسانوں کی ایک خصوصیت اور نرم دلی کہ وہ اپنی فصل میں نقصان اٹھانے کے باوجود سے سیپیوں کو اجرت پوری دیتے ہیں:

> "تین کھیت تین دنوں میں کٹ گئے تو ہم نے گاہی شروع کر دی اس میں بھی کچھ زیادہ دن نہ لگے۔اڑائی کے لیے ہم نے صرف ایک آدمی لگایا۔ جب بھوسہ الگ ہوا اور گندم کا چھوٹا ڈھیر لگا تو میرا جی بیٹھ گیا۔ بڑھئی، لوہار، نائی، دھوبی، مولوی اور دوسرے سیپیوں کا حصہ دینے کے بعد گندم کا ڈھیر اور بھی کم ہو گیا۔ تو میں نے سوچا کہ کسان کی کمائی میں کتنے لوگ شریک ہیں؟ مجھے ڈھوم ڈھاری، مراثی، شیخ، بھرائیں اور کھیت منگتے یاد آئے جو کٹتی فصل میں سے اپنے حصے لے جا چکے تھے اور سلا چگنے والیوں نے اگر اپڑا خوشہ اٹھالیا تھا تو پنچھی پکھیرو بچے کچھے دانوں اس سے اپنے پوٹے بھر چکے تھے اور کسان کے حصے کا ڈھیر گھٹتا رہا۔ گھٹتا رہا حتیٰ کہ چھ مہینوں کی محنت، سردی، گرمی، بیماری، دکھ اور لہو پسینے کا ڈھیر اس سے بلند ہو گیا۔"(۵)

غلام الثقلین نقوی کے ناول کا کینوس وسیع ہے۔ وہ پنجاب کی ثقافتی زندگی اور دیہات کی ثقافتی و معاشرتی اقدار اور روایات کو بڑے خلوص اور حسّیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول پنجاب کی دیہی زندگی کا ثقافتی مرقع ہے۔ گاؤں کی زندگی فطرت کے بہت قریب ہوتی ہے۔ درخت، پودے اور پھول فطری مظاہر کی عکاسی کرتے ہیں۔اس ناول میں مصنف نے فطری مناظر کی بڑی عمدہ تصویر کشی پیش کی ہے۔اس منظر کشی میں گاؤں کی ثقافتی زندگی کی جھلکیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔انھوں نے ثقافتی و سماجی زندگی کی ہر کروٹ اور ہر قوس کو فن کارانہ چابک دستی سے اپنی گرفت میں لیا ہے۔اپنی سر زمین کے باسی اور اسی سر زمین پر بسنے والے انسانوں کے دکھوں اور راحتوں کو بیان کرنے کے خوگر ہیں ۔ناول میں کھیت، کھلیان، ڈالیاں، پگڈنڈیاں یہ سب عناصر دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول میرا گاؤں میں دیہاتی زندگی اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ناول ''میرا گاؤں'' کے آغاز میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "غلام الثقلین نقوی نے پہلی بار پنجاب کے گاؤں کو اس کی واقعی صورت میں اُردو ادب میں منتقل کیا ہے تو بہت سے ایسے الفاظ جو پہلے اردو ادب کے لیے غیر مانوس تھے ایک نئی مانوسیت کے ساتھ ابھر کر اردو زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔اس قسم کے الفاظ جیسے پولا، سیپی۔۔۔وغیرہ غالباً پہلی بار تجربے کے لمس سے آشنا ہو کر اردو ادب میں شامل ہوئے ہیں۔۔۔علاوہ ازیں غلام الثقلین نقوی نے پنجاب کی دیہات کی اصل فضا اس کی مٹی کی باس، دھوپ کی چمک، برکا کی ٹھنڈی نمی اور خوشوں کی لہلہاٹ کو اس خوبصورتی سے گرفت میں لیا ہے کہ پورا گاؤں اردو ادب میں ایک اکھوے کی طرح نمودار ہو گیا ہے۔۔۔ایسا ناول کبھی کبھار تخلیق ہوتا ہے لیکن جب تخلیق ہوتا ہے تو اپنے عہد کا سب سے اہم واقعہ قرار پاتا ہے''۔(۶)

اگر دیکھا جائے تو عصرِ حاضر کے انسان کا سب سے بڑا المیہ فطرت سے روگردانی ہے۔ایک دور ایسا تھا کہ انسان فطرت کا دلدادہ تھا۔ جدید دور کا انسان کائنات کے فطری حسن کو ملیا میٹ کرتا چلا جا رہا ہے۔ سبزہ، پھول، پودے، درخت فطری حسن کے شاہکار ہیں۔ بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ اس فطری حسن میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں۔ مصنف نے فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے اپنے گاؤں کے فطری حسن کا تذکرہ بھی کیا ہے جو جدید دور کے گاؤں میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔

مصنف نے دیہات کی مٹی کو موضوع بنایا ہے۔ گاؤں کے لوگ اپنی دھرتی سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ محبت کا جذبہ مصنف کے نہ صرف دیہاتی کرداروں میں ہے بلکہ شہری کرداروں میں بھی نظر آتا ہے۔گاؤں کے کنوئیں ،کھیت کھلیان، فصلیں، پودے، ہریالی، زمین کی نمی، دارنتی، اناج کی خوشبوئیں قاری کو مسحور کرتی ہیں۔ عصرِ حاضر کے لوگوں نے ترقی کے نام پر پنی اقدار و

روایات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ بیساکھ کے مہینے میں فصل کی کٹائی کے بعد بیساکھی کا تہوار منایا جاتا تھا۔ بیساکھ کا مہینہ بکرمی کلینڈر شمسی کا پہلا مہینہ جبکہ (قمری) کا دوسرا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ کسانوں کے لیے بہت اہم ہوتا تھا۔ گندم کی کٹائی کے موقع پر ایک ثقافتی میلہ ہوتا تھا جو بیساکھی کے میلے کے نام سے مشہور تھا۔ جب سے مشینی زندگی کا آغاز ہوا تب سے یہ ثقافتی اکٹھ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ جدید دور میں یہ کلچر ناپید ہوتا دکھائی دیتا ہے:

"بیساکھ کے مہینے میں جب زمین کا سارا رس کھینچ کر خوشوں میں چلا جاتا ہے۔ تو زمین کی نمی سوکھ جاتی ہے اور پودوں کی بالیاں کڑکڑا جاتی ہیں۔ دھوپ خوشوں کو پکاتی ہے اور جب بالیوں سے پختہ اناج کی خوشبو آتی ہے تو کسان کا جی لہلا اٹھتا ہے۔ اس سمے وہ دنیا جہاں کا مالک بن جاتا ہے۔ پکے ہوئے خوشوں کی خوشبو صدیوں سے میرے خمیر میں رچی ہوئی تھی"۔(۷)

انسان ماضی کی یادوں اور روایات کو بھلا نہیں سکتا۔ قدیم رسومات اور قدریں جو مصنف کو عزیز تھیں اب اُن کا تصور قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔ عصرِ حاضر کی نسل اپنی مٹی سے بہت دور ہو گئی ہے کہ اب گاؤں کی زندگی کو اپنانے سے قاصر ہے۔ ماضی کی تہذیبی فضا اور جدید ثقافت کی رنگینیوں کی کشمکش کو مصنف نے علامت کے پسِ پردہ بڑی فنی مہارت سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے مناظر قدرت کہ ہر رنگ اور ہر روپ کو زندگی کی حرکت اور حرارت کا نغمہ جانا وہ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اپنے تجربات اور محسوسات کو میرا گاؤں ناول میں ڈالتے ہیں اور قاری کو تہذیبی، ثقافتی سماجی اور معاشرتی کیفیات سے روشناس کرواتے ہیں۔ اس ناول کا نام سن کر ہی دیہی کلچر کی خوشبو آتی ہے:

"پگڈنڈی کے دونوں طرف گندم کے کھیت تھے اور ان کھیتوں پر سنہری دھوپ کا پردہ ساتنا تھا۔ باغیچی کے سبز فرش پر سنگترے اور مالٹے کے پودوں کا سایہ تھا۔ میں ایک مدت بعد اس باغیچی میں آیا تھا۔۔۔ میں نے سوچا وہ رنگ برنگی چڑیاں ابھی آئیں گئیں اور مجھ سے ہم کلام ہو جائیں گئیں اور جب تتلی کے اڑتے ہوئے رنگوں کا دھیما نغمہ میرے کانوں میں رس گھولنے لگے گا اور دھنک کے سات رنگ نیلے آسمان تک پل بنائیں گے تو گاؤں کی طرف سے ڈھول بجانے کی آواز آئے گی اور میرا بچپن زندہ ہو جائے گا۔"(۸)

غلام الثقلین نقوی نے ناول میں پنجاب کے دیہات چک مراد کے علاقے کو اس کی مکمل ثقافتی رعنائی سمیت پیش کیا ہے۔ اس خطّے کی مٹی سے محبت ان کے بدن میں رچی بسی ہوئی ہے۔ انھوں نے اس علاقے کی آب و ہوا، مٹی کی ناس اور ثقافتی و سماجی زندگی کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ناول کی اساس گاؤں کے پسِ منظر میں انسانی زندگی کے اُن المیوں پر رکھی گئی ہے جن کا تعلق معاشی و معاشرتی ناہمواریوں سے ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"دیہات کی تہذیب شہر کے تمدن سے کافی مختلف ہے۔ دیہات زمین کے ساتھ چمٹا ہوا ہے لیکن اس کی نظر ہمیشہ آسمان کی طرف رہتی ہے۔۔۔ کسان بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دیہات کی اس نوعیت نے ان کے اس مزاج کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ان سادہ لوگوں کی جذباتی زندگی میں خوشی بلاشبہ اہمیت رکھتی ہے اور غم نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔"(۹)

غلام الثقلین نقوی کے ہاں دیہاتی سماج مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے ناول کا محور دیہات اور دیہات سے منسلک تہذیبی المیے ہیں۔ انھوں نے اُن سماجی و معاشی ہمواریوں کو بھی بیان کیا ہے جو شہروں کی نسبت الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ "میرا گاؤں" میں دیہی سماج میں مختلف مسائل اور مشکلات کا شکار نظر آتا ہے۔ غریب عوام انتہائی کسمپرسی میں زندگی بسر کرتی ہے۔ اگر وہاں کوئی بیماری یا وباء پھیل جائے تو ان کی زندگی کی مزید مشکلات کا سامنا کرتی ہے۔ عبدالرحمٰن کے گاؤں میں جب ملیریا کی وبا پھیلتی ہے تو لوگ مکھیوں کی طرح مرتے چلے جاتے ہیں ان کے کفن دفن کا انتظام بھی گاؤں والوں کو کرنا پڑتا ہے۔ اس وبا کے دنوں میں سب اتفاق اور حسن سلوک سے ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے ہیں۔ ان کے کردار دیہات کی طرح سیدھے سادھے اور

ملنسار ہیں۔ ان کے ہاں خلوص اور ایثار کا یہ جذبہ بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ اُنسیت گاؤں کے کلچر کا خاصہ ہے اور یہ کلچر بھی اب آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا ہے:

> "اس سال ہمارے گاؤں میں ملیریا یا بخار بڑے زور سے پھیلا تھا۔ گاؤں کا کوئی کوئی مرد ہو گا جو بخار سے بچا ہو مجھے بخار نے خوب جھنجوڑا تھا اور میرے باپ کو بھی لیکن بیچارا ابا نتھو بخار سے اپنی جان نا بچا سکا اس کے کفن و دفن کا انتظام گاؤں کے لوگوں نے مل جل کر کیا جنازے میں بہت لوگ شریک ہوئے۔"(۱۰)

یہ ناول 1947ء کے پس منظر میں بھی لکھا گیا ہے۔ اس سال ہندوستان میں تقسیم ہونے کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا۔ ہندو اور سکھ ہندوستان چلے گئے اور مسلمان پاکستان ہجرت کر کے آئے۔ ماہنے کے گھر ایک مسلمان پناہ لیتا ہے۔ ماہنے کے گھر کا نقشہ اور ضروریات زندگی کی اشیاء چک مراد گاؤں کی ثقافتی زندگی کو نمایاں کرتی ہیں۔ کوٹھری میں دہی بلونے والی چاٹی، مٹی کے برتن، گھڑونچی، اُپلے وغیرہ یہ تمام پہلو دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تبدیل شدہ تقاضے کی ایک جھلک ہے۔ علاوہ ازیں دیہات کے دیسی کھانوں کا ذکر ملتا ہے۔ گاؤں کے لوگ زیادہ تر دیسی کھانوں کے شوقین ہوتے ہیں۔ ناشتے میں مکھن، لسی، اچار کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیسی کلچر میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگی۔ سائنسی ترقی کی بدولت زراعت جدید خطوط پر استوار ہونا شروع ہوئی ہے۔ فرسودہ روایات اور طریقہ ہائے کاشت کاری کی جگہ جدید طریقوں کو اپنایا گیا۔ مصنف نے اُن المیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ مہانے اپنے بچپن کی کہانی سناتا ہے۔ اس وقت گاؤں میں آٹا پیسنے کی ایک نئی چکی کا آنا ایک ایسی تبدیلی تھی کہ جیسے ان ہاتھوں کے لیے قبول کرنا بہت مشکل تھا اور ایک عرصے سے لوگوں کے لیے یہ حیرت انگیز چیز رہی۔ مستری نے انجن کے پہیے کو چکر دیئے اور تب انجن چل پڑا اور پٹا حرکت میں آگیا۔ گھگھو سے گھگ گھگ کی آواز نکلی تو بھیڑ میں نے چپ سادھ لی۔ مولویوں کو بلا کر بسم اللہ کرنا دیہاتی ثقافت کا حصہ ہے۔ افتتاح کے بعد مولوی دعا کرتے ہوئے چکی میں دانہ ڈالتے ہیں:

> "مولوی جی! بسم اللہ کیجئے اور اپنے ہاتھ سے دانے چھاننے میں ڈالیے۔ چودھری جی نے کہا۔ مولوی جی نے کچھ آیتوں کی تلاوت کرتے ہوئے حمیداں کی گٹھڑی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔۔۔ مستری کی مدد سے دانے چھاننے میں انڈیل دیے۔ دانے ڈالتے ہوئے مولوی جی کانپ رہے تھے اور سفید پوش مسکرا رہا تھا۔۔۔ کتنا باریک پس رہا ہے۔ میدہ ہے میدہ سلی کی ماں!" (۱۱)

یہ تبدیل شدہ تقاضے کی ایک جھلک ہے۔ اگر ماضی کی تہذیب و ثقافت کو دیکھا جائے تو خوش ہونے اور خوشی منانے کے بہت سے انداز ہمیں ماضی کی ثقافت میں ملتے ہیں لیکن اُس کلچر میں جو رکھ رکھاؤ، شائستگی اور مہذبانہ انداز تھا وہ عصری ثقافت میں ناپید ہو چکا ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر قاری تھوڑی دیر کے لیے ماضی کے نہاخانوں میں جھانکنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اُس کی اصل اقدار و روایات کیا تھیں۔ ثقافتی اقدار میں تبدیلی نے انسان کو ماضی کی اقدار کو بھلانے کی طرف مائل کیا اور انسان بتدریج اپنے ماضی کی اقدار و روایات کو بھولتا چلا جا رہا ہے اور اپنی اصل کھو رہا ہے۔ "میرا گاؤں" کے کرداروں میں دیہات کی بود و باش، پنچایت، جاگیردارانہ نظام اور دیہاتی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ گاؤں میں لوگ سماجی میل ملاپ اور اہم معاملات پر گفتگو کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہوتے تھے۔ اس ملنے والی جگہ کو کچھ لوگ دائرہ کا نام دیتے ہیں اور کچھ تکیہ بھی کہتے ہیں۔ اس جگہ کے ساتھ قبرستان اور ایک کونے میں مسجد بھی ہوتی تھی تکیہ کے ساتھ سایہ دار درخت بھی لگائے جاتے تھے۔ گرمیوں میں لوگ سائے کے نیچے اور سردیوں میں دھوپ میں بیٹھتے تھے۔ ایسی جگہ کی دیکھ بھال کے لیے جو لوگ منتخب ہوتے انھیں فقیر کہا جاتا تھا۔ یہاں پنچائتیں لگنے کے علاوہ بارات یا موقع کی مناسبت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ گاؤں میں پنچایت سسٹم ہوتا تھا جس میں گاؤں کے سارے فیصلے بڑے بزرگ کرتے تھے۔ ایسی کوئی ذمہ داری جو پورے گاؤں پر لاگو ہو اس کی تحریک بھی اکثر پنچایت کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس ناول میں شیماں پر زنا کا الزام لگنے پر گاؤں کے لوگ اس کے نکاح کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ گناہ چوہدری کے مستری سے سرزد ہوا اس لیے یہ فیصلہ مستری کے حق میں ہوا:

"ساری پنچایت چارپائیوں پر بیٹھی تھی اور حقّہ چل رہا تھا۔ چودھری ایک چارپائی پر اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا طرا حسب معمول بلند تھا پر وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اس نے کہا چودھریوں! گندگی اچھلے تو چھینٹے ضرور اڑتے ہیں۔ کون جانے کس کس کے دامن پر دھبہ لگے۔ ہم سب گنہگار ہیں۔ لڑکی بھولی بھالی تھی۔ پھسل گئی۔ میں اسے بے قصور تو نہیں سمجھتا پر یتیم ہے اس لیے اس پر رحم کھانا بہتر ہے۔۔۔ مستری اور شیما قانون کہہ کر دیا جائے اور مستری سے کہا جائے کہ وہ راتوں رات گاؤں سے چلا جائے۔"(۱۲)

دیہی ثقافت کی سماجی قدروں اور اداروں میں سے اہم ادارہ اور قدر جرگہ اور پنچایت کی صورت میں نظر آتا ہے۔ دیہاتیوں کی عدالتوں اور کچہریوں تک رسائی آسان نہیں اس لیے گاؤں بھر کے بزرگ اکٹھے بیٹھ کر مسائل کا حل نکالتے ہیں عموماً پنچایت کا فیصلہ حتمی سمجھا جاتا ہے۔ مرد وزن ان فیصلوں کو من و عن قبول کرنے کے پابند ہوتے ہیں لیکن دیہی ماحول اور کلچر کے برعکس اس ناول کا ایک نسوانی کردار "ماسی" کا جو پنچایت کے غلط فیصلوں پر بغاوت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پنچایت کے غلط فیصلوں پر ماسی کا کردار اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے:

"ماسی کچھ دیر گم سم رہی۔۔۔ ماسی نے پنچایت کو بھی کھری کھری سنائیں۔ پنچائیت نے اس کا حقّہ پانی بند کر دیا تو ماسی نے کہا حقّہ تو میں پیتی نہیں اور پانی اللہ کی نعمت ہے۔ دیکھوں تو کون ہے مجھے روکتا اس کے لانے سے (۱۳)

اوپر الذکر اقتباس پر غور کریں اور ماضی کے جھروکوں میں جھانکیں تو اقدار میں تبدیلی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ انسانی زندگی، سائنسی ترقی کے باعث اپنی اقدار و روایات اور اپرانے رسم و رواج کو چھوڑ کر غیر محسوس طریقے انداز میں نئے دور سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ثقافت کے یہ بدلتے رنگ ناول میرا گاؤں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

انسان جیسے جیسے ترقی کی جانب سفر کرتا ہے تو وہ اپنی گزشتہ تہذیبوں کو تحریری اور تصویری صورت میں محفوظ کر لیتا ہے جیسے تانگے کی سواری ایک طویل تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھتی ہے۔ ماضی کی شاہی سواری تانگہ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے پایا۔ گھوڑے کی مخصوص چاپ زمانے کی گردش میں کہیں کھو گئی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور کا انسان اپنی ثقافتی حیات کو سامنے رکھتے ہوئے جب غور و فکر کرتا ہے تو ماضی کی کئی ثقافتی اشیا پر رشک کرتا ہے جن کی وجہ سے انسان نے اپنی ثقافتی اور تمدنی حیات کی بنیادیں استوار کیں۔ آج کے ماحول میں روایتی تانگے کی سواری ایک طویل تاریخی اور ثقافتی پسِ منظر کی طرف ہماری سوچوں کو منتقل کرتی ہے قدیم دور میں شہری اور دیہاتی زندگی میں نقل و حرکت اور مختصر سفر کے لیے تانگے کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ناول "میرا گاؤں" لائل پور کے ایک چھوٹے سے قصبے کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ فیصل آباد کبھی لائل پور ہوا کرتا تھا۔ لوگ لاری اڈہ سے مقامی مسافروں کو لے کر نکلتے۔ تانگوں کے کوچوان مائی دی بھگی بولے دی جیسے الفاظ سننے کو ملتے تھے لیکن جدید دور نے اس قدیم ثقافتی سواری کو نگل لیا ہے۔ تانگے آج بھی ہمیں ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ قدیم دور میں تانگے کی ثقافتی اہمیت کے حوالے سے مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"پکی سڑک سے ایک تانگہ گاؤں جانے والی چھوٹی سڑک پر مڑا تو وہ میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ پکی سڑک پر سے تانگے اور یکے گزرتے رہتے تھے۔ لیکن ہمارے گاؤں کی طرف کبھی کبھار کوئی تانگہ جاتا تھا۔ یہ تانگہ شہری سا نظر آ رہا تھا، بڑا ہلکا پھلکا بانکا بے ہنگم اور بے ڈول ہوتے ہیں۔ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک برقع پوش عورت دو بچوں کو لیے بیٹھی تھی"۔(۱۴)

"۔۔۔سید پور جانے والی بک پکی سڑک پر یکے اور تانگے چلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم تانگے پر بیٹھنے لگے تو اپنے علاقے کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔۔۔ تانگہ چلتا رہا اور ہم اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔"(۱۵)

وقت کے بدلتے دھارے اور جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ہمارا قدیم کلچر ختم ہو گیا ہے۔ تانگے کی جگہ بس، رکشے ہوائی جہازوں پر سفر کیا جانے لگا ہے۔ جدید دور قدیم دور پر غالب آ گیا ہے۔ قدیم انداز اور کلچر معدوم ہو گیا ہے۔ نئی ایجادات اور نئے زمانے نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح حقّہ

ہماری تہذیب و ثقافت کی ایسی نشانی ہے جو آہستہ آہستہ ماضی کا حوالہ بنتی جا رہی ہے۔ عموماً بستی یا گاؤں کے بزرگ چوپالوں یا دارہ پر کسی خوشی یا غم کے موقع پر اکٹھے ہوتے تو دائرے میں گھومنے والا حقّہ ان کے اتحاد کی علامت بنتا ہے۔ باری باری سب حقّے کا کش لگاتے ہیں اور اپنے گاؤں کے دکھ سکھ بانٹتے ہیں زمانہ قدیم میں حقّہ کی گڑگڑاہٹ محفلوں کی جان ہوا کرتی تھی۔ حقّہ ایک شغل اور فرصت کے چند لمحات کا ساتھی سوچ اور تخیل کو مہمیز دینے کے لیے ایک سکون کا وقفہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حقّہ سازی کی طرف رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے حقّے کی مٹتی ہوئی روایت کا ذکر بھی کیا ہے۔

کھیل بھی کسی ثقافت کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید دور میں انسان نے بے شمار کامیابیاں اور ترقی حاصل کی وہیں اپنی معاشرتی اقدار، ثقافت اور رسم و رواج سے بھی دور ہو گیا ہے۔ پنجاب میں جو کھیل، میلے ٹھیلے، تہوار ان پر جدت کا رنگ غالب آ گیا۔ گلی ڈنڈا پنجاب میں بچوں اور لڑکوں کا مقبول کھیل ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑیوں کی تعداد میں کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ یہ کھیل پنجاب میں اب صرف چند ایک دیہات تک ہی محدود ہے۔ اس کے علاوہ شٹاپو بھی پنجاب کا قدیم کھیل ہے۔ اس کھیل میں کئی لڑکیاں حصہ لیتی ہیں۔ لڑکیاں چاک سے زمین پر خانے بناتی ہیں اور ایک گول کنکری سے زمین پر کھینچے گئے خانوں کے اندر پھینکتی ہیں اور ایک پاؤں پر چل کر کنکری کو اٹھاتی اور خانوں کو پھلانگتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ کھیل معدوم ہو گیا ہے۔ بے شمار کھیل ایسے ہیں جو اب پنجاب میں ختم ہو گئے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی نے جہاں ہمارے قیمتی ثقافتی اثاثے کو مٹتا دیکھا ہے اُس کا نوحہ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ ماضی کی اقدار و روایات کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اس ناول میں کنچے کھیلنے اور شٹاپو کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شہروں اور خاص طور پر دیہاتوں کا کلچر رہا ہے:

> "ہم نے خانے بنا کر شاہ شٹاپو کھیلنا شروع کیا۔ شیماں ایک ٹانگ پر کھڑی ٹھیکری کو دوسرے پاؤں سے ٹھوکر لگا کر خانے سے باہر نکالنے والی تھی کہ گاؤں کے شمال میں گھگ گھگ کی آواز آئی۔"(۱۶)

> "اس نے قمیض کی جیب سے چند بلوری کی گولیاں نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیں۔ سفید، نیلی اور سرخ گولیاں۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے انھیں آگ سی لگ گئی تو میری ہتھیلی جلنے لگی۔۔۔ ماننے! شیماں نے پہلی بار ان گولیوں کو دیکھا تھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہے گئی تھیں۔"(۱۷)

غلاالثقلین نقوی نے ناول "میرا گاؤں" میں گاؤں کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ یہ گاؤں صرف پرندوں کی چہکار ہی نہیں سنتا بلکہ باہر ہونے والے ہنگاموں کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ یہ آوازیں کبھی چکی کی گھگ گھگ اور ٹیوب ویل کی صورت میں سنائی دیتی ہیں تو کبھی سیلاب اور بم دھماکوں کے شور میں سنائی دیتی ہیں۔ ان میں بعض آوازیں خوشی اور مسرت کا باعث بنتی ہے اور کچھ گاؤں کی دیواریں تک ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کو پڑھ کے دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو کسانوں کے، کھیتوں، کھلیانوں، ڈھور، ڈنگروں، پودوں کی صورت میں ملتا ہے۔ دوسرا پہلو باہر کے طوفانوں سے روشناس کرواتا ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف دیہی کلچر کی منظر کشی پیش کی ہے بلکہ وہاں کے اندرونی و بیرونی مسائل کی وجوہات کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے ناول میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار بڑے موثر انداز میں کیا ہے اور مٹتی ہوئی تہذیب کو اس ناول میں دوبارہ امر کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نورین رزاق، ڈاکٹر۔ پاکستانی خواتین افسانہ نگار۔ لاہور: دستاویز، ۲۰۱۶ء۔ ص ۱۵۷

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر۔ اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، الٰہ آباد: رائٹرز گلڈز، ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۳۰

۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔ ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء۔ ص ۳۱۴۴

۴۔ غلام الثقلین نقوی۔ میرا گاؤں۔ لاہور: ابلاغ پبلشر، ۲۰۰۰ء (طبع دوم)۔ ص ۶

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۱۵

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ ایک گاؤں کی کہانی۔ مشمولہ، میرا گاؤں۔ ص ۱۶

۷۔ ایضاً۔ ص ۱۱۴

۸۔ ایضاً۔ ص ۱۲۲

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر۔ غلام الثقلین نقوی شخصیت و فن۔ اسلام آباد: کادمی ادبیات، ۲۰۰۱ء۔ ص ۲۷

۱۰۔ غلام الثقلین نقوی۔ میرا گاؤں۔ ص ۹۸

۱۱۔ ایضاً۔ ص ۲۵

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۱۵۱

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۲۳۹

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۲۳۴، ۲۳۳

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۳۳۶

۱۶۔ ایضاً۔ ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً۔ ص ۷۰